معاوضہ کو "دیت" ..... عصر حاضر کے معروف مفسر مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں۔

"قصاص، قصص ہے، جس کے اصل معنی کسی کے پیچھے، اس کے نقش قدم کے ساتھ ساتھ چلنے کے ہیں (پھر مولانا نے بعض قرآنی آیات کا حوالہ دیا مثلاً سورہ قصص آیت 11، سورہ کہف آیت 64 ..... اس کے بعد فرماتے ہیں) اس سے "قصاص" نکلا اس لئے کہ قاتل کا بھی کھوج لگایا جاتا اور اس کا تعاقب کیا جاتا ہے پھر "قصاص" اس سزا کو کہنے لگے جس میں "مجرم" کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جائے جس کا مرتکب وہ خود ہوا ہے" (تدبر قرآن ج۔ 1 ص۔ 387)

مولانا اصلاحی اس سے متصل ہی "دیت" کو بھی "قصاص" ہی کی شکل قرار دیتے ہیں جو اپنی جگہ بالکل صحیح ہے۔

"اس "قصاص" کی دو صورتیں ہیں ایک جانی دوسری مالی، جس کو "دیت" یا "خون بہا" کہتے ہیں۔ "قصاص" کا نقطہ اپنے وسیع معنی میں ان دونوں ہی صورتوں پر حاوی ہو جاتا ہے اس لئے کہ دیت بھی درحقیقت قصاص کی ایک شکل ہے۔ اصل قانون تو جان کے بدلے جان ہی کا ہے لیکن اولیائے مقتول (مقتول کے وارث) کی بہبود کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس قانون میں اتنی رعایت فرما دی ہے کہ اگر وہ چاہیں تو جان کے بدلے "دیت" بھی لے سکتے ہیں" (تدبر قرآن ج۔ 1 ص۔ 387 مطبوعہ لاہور 1976ء)

مولانا کے یہ نوٹس سورہ البقرہ کی آیات 178۔ 179 کے ضمن میں ہیں جو اس معاملہ میں اصل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان آیات میں انسانی جان کے احترام کے لئے جہاں قصاص (قتل کا بدلہ قتل) کا ضابطہ ارشاد فرمایا گیا اور اس کی ذمہ داری اسلامی حکومت پر ڈالی گئی (دیکھیں تدبر قرآن ج۔ 1 ص۔ 388، اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی جلد 2/ 16 ص 173 تا 180 و جلد۔ 9 ص۔ 524 تا 528) وہاں مساوات کا بھرپور اہتمام بھی کیا گیا جو اسلام کا اعلیٰ اصول ہے کیونکہ دور جاہلیت میں انسانی جان کے معاملہ میں خوفناک حد تک عدم مساوات کی حکمرانی تھی کہ زیادہ معتبر قبائل اپنی عورت کے بدلے دوسرے قبیلے کے مرد کو، اپنے غلام کے بدلے دوسرے قبیلہ کے آزاد مرد کو یا اپنے ایک آدمی کے بدلے دوسرے قبیلہ کے دو مردوں کو قتل کر ڈالتے..... وغیرہ ذالک، اس کا بھی اللہ تعالیٰ نے سختی سے سدباب کیا اور بقول مولانا اصلاحی

"یہ اس کامل مساوات کا بیان ہے جو قصاص میں لازماً ملحوظ رکھنی ہے" (تدبر ص۔ 389 جلد۔ 1)

انہی آیات میں قتل کے بدلے قتل کے بجائے دیت اور خون بہا کی اجازت بھی دیدی گئی ہے لیکن مقتول کے وارثوں کی اجازت سے، جس کا صاف ستھرا مطلب یہی ہے کہ "دیت کی اجازت" "قتل عمد" میں بھی ہے۔ لیکن حکومتی یا خارجی دباؤ سے نہیں بلکہ محض مقتول کے وارثوں کی مرضی سے، یہی چیز ہے جسے اس آیت میں "تمہارے رب کی طرف سے ایک قسم کی تخفیف اور مہربانی" سے تعبیر فرمایا گیا۔ کیونکہ مائدہ کی آیت 45 میں "نفس کے بدلے نفس" کا حکم ہے اور چونکہ شرائع میں بہت سے معاملات یکساں ہیں اس لئے شبہ ہو سکتا تھا کہ شریعت اسلامیہ میں بھی محض "جان کے بدلے جان" کا ہی قانون ہو گا، لیکن فرما دیا گیا کہ بنی اسرائیل اور امت مسلمہ کا معاملہ "جان کے بدلے جان" کی حد تک تو یکساں ہے ہاں مقتول کے وارث راضی ہو جائیں تو "دیت" بھی ہو سکتی ہے، یہی تخفیف اور رحمت ہے، جس کا بطور احسان اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا۔

البتہ قتل کی ایک اور صورت "قتل خطا" ہے، اس میں محض "دیت" ہی ہے، جان کے بدلے جان نہیں کیونکہ وہاں انسانی عزم و ارادہ کا کوئی دخل نہیں۔ اس کا ذکر سورہ نساء کی آیت 92 میں ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے

"اور کسی مومن کے لئے روا نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کرے مگر یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے اور جو کوئی کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو اس کے ذمہ ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا اور خوں بہا (دیت) ہے جو اس کے وارثوں کو دیا

جائے الایہ کہ وہ معاف کر دیں"

اس مقام پر "قتل خطا" کے ضمن میں مسلمہ اصول "دیت" ہی ہے' گویا قتل عمد میں تو مقتول کے وارثوں کی مرضی و منشاء اور ان کی طرف سے معافی کے بعد "دیت" ہو گی لیکن "قتل خطاء" میں بہرحال "دیت" ہو گی کیوں کہ اس میں جیسا کہ عرض کیا گیا انسانی عزم و ارادہ کا کوئی دخل نہیں' اس کی شکل یہی ہو سکتی ہے کہ انسان شکار کر رہا تھا شکار کے لئے گولی چلائی تیر پھینکا' وہ انسان کو جا لگا' جہاز کا حادثہ ہو گیا' ریل کا حادثہ ہو گیا' بس' ٹرک' ویگن' موٹر کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ان کی زد میں کوئی آ گیا وغیرہ ذالک۔ یہ ساری باتیں ایسی ہیں جن میں انسان بے بس ہے اور ایسی تمام شکلوں میں "دیت" ہو گی۔ جس کا تعلق "عرف" سے ہے یعنی زمانہ کے رسم و رواج سے۔ یہ دیت مقتول کے وارثوں کو دی جائے گی اور ساتھ ہی ایک غلام کی آزادی کا ذکر ہے۔ مولانا اصلاحی کے بقول۔ "زیر بحث آیت میں توبہ کے طور پر غلام آزاد کرنے کا حکم بھی ہے۔ اس زمانے میں چونکہ غلامی ختم ہو چکی ہے اور یہ بات ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ اس کا (غلامی کا) ختم ہونا عین منشائے اسلام کے مطابق ہوا ہے اس وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس زمانے میں وہ شخص کیا کرے جو غلام آزاد کرنے کی مقدرت تو رکھتا ہو لیکن غلام میسر نہیں ہیں اور شریعت نے اس کا کوئی بدل بھی معین نہیں فرمایا ہے ہمارے نزدیک اس زمانے میں اس کا بدل صدقہ ہے جو غلام کی قیمت کے تناسب سے ہو اور اگر یہ صدقہ غریب و نادار مسلمانوں کے قرضوں کی ادائیگی اور ان کے رہن شدہ مکانوں اور سامانوں کے چھڑانے پر صرف کیا جائے تو انشاءاللہ تعالیٰ یہ طریقہ شریعت کے منشاء کے خلاف نہ ہو گا" (تدبر قرآن ج۔ 2 ص۔ 133۔ 134 مطبوعہ لاہور 1976ء)

اس کے بعد رہ جاتا ہے "دیت" کا معاملہ تو البقرہ کی آیت 178 میں "المعروف" کا ذکر ہے یعنی "عرف و رواج" کے مطابق معاملہ طے ہو گا۔ مولانا اصلاحی کے بقول۔ "جن معاملات کا تعلق "معروف" سے ہو وہ زمانہ اور حالات کے تغیر سے اپنے اصل مقصد کو باقی رکھتے ہوئے متغیر ہو جاتے ہیں مثلاً خون بہا میں اونٹوں اور بکریوں کی جگہ نقد بھی دیا جا سکتا ہے اور نقد کی مقدار بھی معاشی حالات کی تبدیلی سے تبدیل ہو سکتی ہے اس تغیر کی نوعیت کو طے کرنا ارباب اجتہاد کا کام ہے اور سلف کے اجتہادات کی نظیریں اس باب میں موجود ہیں (تدبر ج۔ 2 ص۔ 133)

## معروف کیا ہے؟

قرآن مجید کے لفظ "معروف" پر مولانا اصلاحی کا نوٹ آپ نے پڑھ لیا' یہی ایک جگہ نہیں' قرآن میں جا بجا "معروف" اور "عرف" کو اپنانے کا ذکر ہے۔ یہ درحقیقت ایک "فنی اصطلاح" ہے جس کا تعلق اصول فقہ سے ہے' بعض جلیل القدر علماء کے حوالہ سے اس کی تعریف میں جو کچھ منقول ہے وہ یہ ہے

الف: جدید مصر کے محقق عالم الشیخ ابو زہرہ فرماتے ہیں۔

"عرف" وہ طریقہ ہے جس پر عمل کرنے کے لوگ عادی ہو گئے ہوں اور اس پر لوگوں کے امور قائم ہو چکے ہوں" (اصول فقہ ابو زہرہ ص 273)

استاذ مصطفیٰ زرقاء نے جو تعریف کی ہے وہی معروف حنفی فقیہ علامہ ابن عابدین سے منقول ہے یعنی

"قول یا عمل میں جمہور کی عادت کا نام عرف ہے" (بحوالہ 'فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر ص 372 از استاذ تقی امینی علی گڑھ)

استاذ عبدالوہاب خلاف کے بقول عرف نام ہے

"لوگوں کے متعاد و متعارف امور' خواہ ان کا تعلق قول سے ہو فعل سے' ترک سے ہو یا اجتناب سے' انہے عادت بھی کہتے ہیں" (نظام الحکم فی الاسلام ص 394)

انہی تعریفات کی روشنی میں استاذ عبدالوہاب خلاف نے ایک جامع تعریف اس طرح کی کہ

"عرف جمہور کے متعاد و اقوال' افعال' یا ترک سے عبارت ہے بشرطیکہ کتاب و سنت کے خلاف

نہ ہو (علم اصول فقہ از عبدالوہاب خلاف ص ۸۹)

اسلام نے "عرف" کا بہت لحاظ رکھا ہے اور "دیت" کا معاملہ تو تمام تر "عرف" ہی سے متعلق ہے جیسا کہ پہلے بھی اشارہ ہوا' اور آئندہ بھی آئے گا۔ بدقسمتی سے ہمارے یہاں چونکہ "اجتہاد" کا دروازہ بند ہے اور ہم نے اپنی بدنصیبی سے جدید مسائل پر غور و فکر کا سلسلہ منقطع کر رکھا ہے اور ہر جگہ قدیم فقہی روایات کا ہی سہارا لیتے ہیں اس لئے ردعمل وہی ہوتا ہے جو قصاص و دیت آرڈیننس پر ہوا۔ ہمارا خدانخواستہ یہ مقصد نہیں کہ قدیم فقہا کی کاوشیں نظرانداز کر دی جائیں' ان حضرات نے بے حد محنت کی ہے اور ان کا اس امت پر عظیم احسان ہے' لیکن دیکھنا یہ ہے کہ وقت کتنی انگڑائیاں لے چکا ہے' جب تک ان معاملات پر غور و فکر ہو گا کوئی بات صحیح طور پر حل نہ ہو سکے گی۔

جہاں تک قتل کا تعلق ہے' اس کی دو ہی شکلیں ہیں جان بوجھ کر قتل کرنا یا حادثاتی طور پر ایسا ہو جائے جسے "خطاء" کہتے ہیں۔ محدث اندلس امام ابن حزم ظاہری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

> "قتل کی دو قسمیں' جان بوجھ کر یا خطا کے طور پر' اس کی دلیل قرآن کی آیات ہیں یعنی النساء کی آیات 92- 93- تیسری کوئی قسم نہیں جو حضرات مزید اقسام کی بات کرتے ہیں ان کا ارشاد درست نہیں" (المحلیٰ ج- 10 ص- 214 مطبوعہ مکہ مکرمہ 1988ء)

اصل میں ہمارے فقہاء نے کئی قسمیں بیان کی ہیں۔ جان بوجھ کر قتل تو واضح ہے' اس کے علاوہ قتل خطا شبہ عمد وغیرہ محض تعبیرات کا اختلاف ہے۔ مثلاً ایک شخص شکار کر رہا ہے گولی انسان کو لگ گئی یا آلہ ایسا تھا جس سے عام طور پر انسان قتل نہیں ہوتا' یہ سب تعبیرات کے اختلاف ہیں اور اصل وہی ہے جو ابن حزم نے کہا کہ قتل کی دو ہی قسمیں ہیں اور دیت دونوں ہی میں ثابت ہے۔ قتل خطا کی ہر شکل میں تو نص قرآنی سے محض دیت ہی ثابت ہے اس میں جان کا بدلہ جان ہو ہی نہیں سکتا البتہ قتل عمد میں جان کا بدلہ جان نص قرآنی ہے اور وارث کی خواہش و مرضی سے مالی معاوضہ ہو سکتا ہے بعض حضرات جو شدت سے قتل عمد میں دیت کا انکار کرتے ہیں' ان کا موقف صحیح نہیں' ان کے جذبات کی شدت سمجھ میں آنے والی چیز ہے کہ صاحب یہ بڑا گناہ ہے اور ایک انسان کا قتل قرآن کی رو سے ساری انسانیت کا قتل ہے اور یہ کہ قتل عمد پر اللہ تعالیٰ نے غضب' لعنت اور دائمی جہنم کی وعید سنائی ہے' یہ سب باتیں درست ہیں لیکن آخر البقرہ کی آیت 178 میں اللہ تعالیٰ نے مقتول کے وارثوں کو جو حق دیا اور جسے "تخفیف اور رحمت" سے تعبیر کیا' اس کا مقصد کیا ہے؟ اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ قتل عمد میں بھی دیت کا جواز ہے۔

پنجاب یونیورسٹی کے مقالہ نگار نے اپنے مقالہ میں دیت سے متعلق تفصیل دی ہے' ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

> "آئین دیت کی تاریخی اصل زمانہ قبل از اسلام کے رواجی دستور (یعنی عرف ہے) میں پائی جاتی ہے جب کہ یہ عرب کے معاشرتی نظام کے ساتھ لازم و ملزوم تھا۔ معاشرے کی بنیاد قبائلی زندگی پر تھی ملک میں کوئی سیاسی اقتدار عام موجود نہیں تھا بلکہ کسی قبیلہ میں طیعہ شکل میں بھی نہیں پایا جاتا تھا' اپنا انصاف خود چکانے کا رواج تھا۔ قتل کی صورت میں شخصی طور پر بدلہ لینے کا قاعدہ خاص طور پر ہر جگہ نافذ تھا اگرچہ یہ ممکن تھا کہ اس حق سے با اختیار خود کوئی دست بردار ہو جائے اور اس کے بدلے میں دیت لینا منظور کر لے' اس دیت کی مقدار اصولاً سو اونٹ مقرر تھی کم از کم اس علاقے کے اندر جہاں اسلام وجود میں آیا اگرچہ بعض روایات میں صرف دس اونٹوں کا بھی ذکر ہے۔ اسلام نے اس رواج کی اصل بنیاد میں مداخلت نہیں کی" (انسائیکلوپیڈیا ص 524 سے 528 جلد 9 میں تفصیل ہے)

روایات کے مطابق ابتدا میں دس اونٹ ہی انسانی جان کا فدیہ و عوضانہ تھا لیکن ایک خواب کے پیش نظر حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا حضرت عبدالمطلب کو اپنے ایک بیٹے کی قربانی کرنا پڑی تو ایک خاص مجلس میں قرعہ اندازی کی گئی جس میں ایک طرف اونٹوں کا کہہ ہوتا اور دوسری طرف عبدالمطلب کے بیٹے حضرت عبداللہ کا (حضور اقدس کے والد گرامی) اور بالآخر جب سو اونٹ اور حضرت عبداللہ کے درمیان قرعہ اندازی ہوئی تو سو اونٹ کا قرعہ نکل آیا

اس کے بعد سواونٹ کا رواج ہو گیا لیکن اس کے باوجود اس سے کم یا زیادہ کے ثبوت موجود ہیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ سواونٹ کی دیت لازم نہ تھی۔ اسلام نے اس رواج کو عملاً قائم رکھا' لیکن اپنی اصل کی حد تک' کیونکہ جدید تمدنی حالات ہر حال میں سواونٹ بطور دیت کے لئے سازگار نہ تھے ایک مقالہ نگار کے بقول۔

"تاہم بہت عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ یہ قانون مسلمانوں کے جدید معاشرے کے حالات کے لئے سازگار نہ رہا۔ معاشرہ ترقی کر کے بہت جلد ایسی جماعت بن گیا جو نظری طور پر متحد اور بالخصوص ایک منظم ریاست کی صورت میں نمودار ہوئی۔ ماہرین قانون نے دیت کا ایک نظریہ قائم کیا جس کے اندر مختلف میلانات کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ یہ نظریہ عموماً سنی اور شیعہ دونوں مسلکوں میں یکساں پایا جاتا ہے"

ہمارا مقصد بھی یہی ہے کہ "نظریہ دیت" تو ثابت شدہ حقیقت ہے لیکن سواونٹ یا کوئی متعین رقم طے شدہ نہیں اس کا انحصار عرف وعادت اور زمانہ کے رواج پر ہے۔ اب وہ قبائلی سسٹم نہیں' اگر کہیں ہے تو وہاں قبیلہ کا پنچائتی سسٹم اب موثر نہیں ہے۔ جہاں تک منظم حکومتی سلسلہ اور اجتماعی سوسائٹی کا معاملہ ہے وہاں حالات و زمانہ کی رعایت کے تحت اصحاب اجتہاد (پارلیمنٹ اور مقننہ) ہی فیصلہ کی ذمہ دار ہیں۔ ہمارے سامنے خلافت عثمانیہ کی مثال موجود ہے جو دور آخر میں مسلمانوں کی نہایت درجہ منظم اور متمدن حکومت تھی' جس میں انیسویں صدی کے وسط میں بہت حد تک قانون کی اصلاح ہو چکی تھی اور اس ضمن میں باقاعدہ قانون نافذ العمل تھا اور 1863ء کے قانون تعزیرات میں سرکاری طور پر دیت کی مقدار 224 ترکی پونڈ مقرر تھی (فقہ القرآن ج۔ 4 ص۔ 460 مطبوعہ کراچی 1984ء)

عربوں کے یہاں نزول اسلام سے قبل چونکہ قتل وغارت ایک کھیل تھا اس لئے بربنائے مصلحت اسلام نے ابتداً سواونٹ کی دیت برقرار رکھی کہ تعزیر اً سخت سزا بسا اوقات جرائم کے سدباب میں موثر ہوتی ہے۔ اس کے بعد خلافت راشدہ کے دور میں درہم ودینار کے حوالہ سے بھی مخصوص مقداروں کا ذکر ملتا ہے مثلاً امام مالک کے نزدیک جن کا سکہ دینار (سونے کا) ہے انہیں ایک ہزار دینار اور جن کا سکہ درہم (چاندی کا) ہے انہیں بارہ ہزار درہم دینا ہوں گے۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کی مصر جانے سے پہلے اور بعد رائے مختلف تھی' بعض روایات کے مطابق خود دور رسالت میں بھی درہم ودینار کی شکل میں دیت کا ثبوت ملتا ہے اور حضرت عمرؓ نے اونٹ گراں ہو جانے کے سبب بارہ ہزار درہم یا ایک ہزار دینار مقرر فرمائے اور جن کے پاس گائیں ہیں ان پر دو سو گائیں اور بکری کے مالکان پر دو ہزار بکریاں اور کپڑے کے تاجروں پر دو سو جوڑے (بڈھیا) مقرر فرمائے۔ (بدایتہ المجتہد ج۔ 2 ص۔ 411)

یہ ساری باتیں اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ "دیت" کی رقم طے شدہ نہیں حالات زمانہ کے تحت اس میں تبدیلی ہو گی اور عرف وعادت کا لحاظ رکھا جائے گا۔

دیت میں ایک مسئلہ "عاقلہ" کا آتا ہے یعنی قاتل کے عزیز رشتہ دار مل کر اس کو ادا کریں اس ضمن میں امام ابن حزم رحمہ اللہ تعالیٰ کی تصریح یہ ہے کہ

"قتل خطائیں "عاقلہ" کے مال سے ادائیگی ہوتی اور قتل عمد میں دیت قاتل کے مال سے ہی ادائیگی ہو گی" (محلیٰ ج۔ 10 ص۔ 282)

اس ضمن میں ہمارا موقف یہ ہے کہ یہ سراسر سینہ زوری ہے خاص طور پر قبائلی سسٹم کے ملیامیٹ ہونے کے بعد اس کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہ جاتی۔ قبائلی سسٹم میں "اجتماعیت" کا ایک خاص نظم ہوتا ہے۔ ایسے معاشرے میں یہ باتیں چل جاتی ہیں لیکن اب ہم لوگ جس قسم کے معاشرہ میں جی رہے ہیں ایسی باتیں نہیں چل سکتیں ویسے بھی قرآن عزیز کا جرائم کے معاملہ میں موقف یہ ہے کہ جو کرے سو بھرے۔ اسلام کا یہ مسلمہ اصول ہے' ایک معروف آیت ہے جس کا ترجمہ ہے۔

"کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا"

یہ آیت قرآن میں پانچ جگہ موجود ہے 6/164' 17/15' 35/18' 39/7' 53/38' اس کے علاوہ سورہ نمبر 2 آیت 286' سورہ 3 آیت 25' آیت 161' سورہ 14 آیت 51' سورہ 74 آیت 38 وغیرہ

میں اس اصول پر بہت زور دیا گیا ہے کہ جو جرم کرے گا اسے ہی اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

ہمارے ملک میں چونکہ بدقسمتی سے ہمیشہ عبوری نوعیت کے حالات رہے، آئین کے حوالہ سے ہمارا حال پتلا ہے پہلا اور آخری متفقہ آئین 1973ء کا تھا جسے بہت سے لوگوں نے اپنی اغراض کے پیش نظر ایسا برباد کیا کہ اب اس کی اصل شکل پہچاننی مشکل ہو گئی ہے۔ ہنگامی فیصلے، اور افراتفری میں کیے گئے اقدامات ایک آزاد، باوقار اور متمدن قوم کے شایان شان نہیں، سب سے بڑا المیہ جمود و تقلید کا ہے۔ رجال کار کی کمی نہیں بلکہ فقدان ہے۔ ان حالات میں جو قدم اٹھایا جائے گا اس سے اسی قسم کے حالات پیدا ہوں گے جیسے ہم نے ڈرائیور حضرات کی ہڑتال کی شکل میں دیکھا۔ جس میں قوم پریشانی میں ڈوب گئی۔ اس لئے ارباب حل وعقد، عدلیہ کے معزز ارکان اور اہل علم پر لازم ہے وہ باہم مل کر سر جوڑ کر بیٹھیں اور اسلام کے حقیقی نظام عدل کو اس کی اصل شکل میں معروضی حالات کا جائزہ لے کر نافذ کریں کہ اس میں ہم سب کی عافیت ہے۔

"قصاص ودیت" سے متعلق اسلامی نظریاتی کونسل کی ابتدائی رپورٹ میں "عاقلہ" کے تصور کا ذکر تھا، لیکن موجودہ آرڈیننس میں اس کا ذکر نہ تھا اب ہنگامی طور پر نظریاتی کونسل کی میٹنگ بلائی گئی اس کے جو فیصلے بعض ذرائع سے اخبارات میں آئے ہیں ان میں بھی "عاقلہ" کا تصور سامنے آیا ہے، ہم اپنا نقطہ نظر ذکر کر چکے ہیں لیکن یہ بھی طے ہے کہ یہ اجتہادی مسئلہ ہے اور موجودہ زمانے میں یہ معاملہ بہت غور وخوض بلکہ اجتہاد کا متقاضی ہے، "عاقلہ" کا تصور بنیادی طور پر قبائلی معاشرے سے تعلق رکھتا ہے جس کا آج کی متمدن اور منظم دنیا میں کوئی وجود باقی نہیں رہا، یہ معاملہ تحقیق طلب ہے کہ اسلام نے عاقلہ کا رواج کس طرح اور کس حد تک باقی رکھا اور آج کے جدید معاشرے میں ہم عاقلہ پر قیاس کر کے کس قسم کے ادارے وجود میں لا سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل نے کارکنوں کی یونین، کمپنی وغیرہ کا جو تصور دیا ہے وہ ایک اجتہادی رائے ہے اس پر غور کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک تو اصل یہ ہے کہ "مکلی خزانہ" سے اس نقصان کی تلافی کی جائے جیسا کہ ہم نے حدیث سے حوالہ بھی دیا لیکن اگر ارباب اجتہاد ایسا ہی خیال کرتے ہیں تو اس پر پارلیمنٹ سے بھی رائے لی جا سکتی ہے، ایسا امداد باہمی کے اصول پر کس درجہ ممکن ہو سکتا ہے، یہ بات بہرحال واضح رہنی چاہئے کہ دیت ابتدا میں قاتل پر آتی ہے وہ جب ادائیگی سے بے بس ہو تو پھر وہ تعاون مانگ سکتا ہے تاہم ہم اہل علم سے درخواست کریں گے کہ وہ اس مسئلہ پر ضرور غور کریں کہ بقول ڈاکٹر وہبۃ الزحیلی قبائلی نظام دم توڑ چکا ہے اور اس کی جگہ ایک باقاعدہ نظام حکومت لے چکا ہے تو اصل ذمہ داری حکومت پر ہی آتی ہے (الفقہ الاسلامی و ادلتہ ج۔ 6 ص۔ 326) بہرحال اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ جو قدم اٹھایا جائے سوچ سمجھ کر اٹھایا جائے۔

## مبارکباد

ماہ نامہ نقیبِ ختم نبوت جہاں بہت سے طباعتی محاسن سے معمور ہے۔ وہیں اس کا ایک نمایاں جمالیاتی پہلو یہ ہے کہ اس میں عموماً کتابت کی اغلاط نظر نہیں آتیں جو میرے خیال میں پروف ریڈنگ پر بھرپور توجہ کا نتیجہ ہے۔ املائی اغلاط یا استقامِ کتابت کسی بھی تحریر کے اثر کو کم کر دیتی ہیں خصوصاً شعر کے تنِ نازک پر اس سے خراش آجاتی ہے جو اربابِ نظر پر گراں گزرتی ہے۔

ع تُو اور ہو مجروحِ تماشا مرے آگے۔

چنانچہ اس حسن کتابت پر میں ادارے کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

پروفیسر عاصی کرنالی (ملتان)

ڈاکٹر رشید ارشد

# جمہوریت: صیہونی اکابر کی نظر میں

## تصورِ جمہوریت کو قبول کرکے ہم اپنے ناخنوں سے خود اپنے سر کو زخمی کر رہے ہیں اور خون دیکھ کر حیران ہوتے ہیں کہ یہ کہاں سے آیا۔

جمہوریت .... جادو کی اس خوبصورت پری جس کا نام پوری دنیا میں انتہائی عقیدت و احترام سے لیا جاتا ہے، کا رشتہ دینِ مصطفےٰ سے کیا ہے؟ دیکھنا، پرکھنا اور تجزیہ کرنا وقت کی اہم ضرورت تھا اور ہے۔ آج جب ہم "دنیا" کا لفظ استعمال کرتے ہیں، تو دراصل ہم بغیر محسوس کیے ہوئے مغرب کا نام لے رہے ہوتے ہیں۔ وہ کیوں؟ وہ اس لیے کہ موجودہ ترقی یافتہ دور میں مغرب ہی اقوامِ عالم کا ایک معیار بن چکا ہے۔ ترقی کی اس دوڑ میں مغرب ہی سب کا امام ہے۔ جو مغرب میں ہو رہا ہے وہی باقی دنیا کے لیے ایک مثال یا نمونہ سمجھا جاتا ہے، کیونکہ مغرب نے موجودہ جمہوریت

کو کامیابی کا تاج پہنا دیا ہے، لہٰذا ہم سب کا فرض ہے کہ اس خوبصورت چیز کو ہر قوم و ملک کے لیے عوامی مسائل حل کرنے کا واحد اور کامیاب ترین طریقہ سمجھتے ہوئے اپنے اپنے ملک میں نافذ کریں، لیکن ایک حقیقت ہم میں سے چند لوگ ہی جانتے ہوں گے کہ جمہوریت کی اس جادو کی پری کا بنانے والا اور اس کو قوت و حرکت بخشنے والا جادوگر کون ہے؟ آپ جانتے ہیں، جادوگر دنیا کا چالاک ترین شخص ہوتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ دنیا کے سامنے وہ ننگا ہو جائے۔ دنیا اس کی چالوں کو سمجھ کر اس کے جادو کا بھانڈا چوراہے پر پھوڑ دے لہٰذا وہ اپنے چہرے کو اس طرح ڈھانپ کر اور بدل کر رکھتا ہے کہ اس کی شناخت ممکن نہ ہو سکے۔ اس جادوگر کا نام ہے "یہودی"۔

آپ جانتے ہوں گے کہ عیسائیوں کا اصل دشمن یہودی تھا اور یہ دونوں اقوام ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرِپیکار رہی ہیں، لیکن اب عیسائیوں نے یہودیوں سے سمجھوتہ کر لیا ہے، خصوصاً گزشتہ ایک صدی سے۔ اب عیسائی انجیلِ مقدس پڑھنے سے پہلے زبور و تورات کو پڑھنا و پڑھانا ضروری سمجھتے ہیں۔ اب اپنے مشترکہ دشمن "اسلام" کو ان دونوں قوموں نے اپنی نظروں کے سامنے مرکوز کر رکھا ہے۔ ملک اسرائیل کی تخلیق اور افزائش پر غور کریں، تو آپ کو سب کچھ سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ اب آپ دیکھ رہے ہیں کہ مغرب اور اسرائیل ایک دوسرے کے لیے کس طرح لازم و ملزوم بن چکے ہیں۔ اقوامِ مغرب نے یہ بچہ "اسرائیل" بڑی سوچ بچار کے بعد پیدا کیا ہے اور بہت کڑے و محتاط انداز میں اس کی پرورش و حفاظت کی جا رہی ہے۔ لیکن یہ بچہ دراصل بچہ نہیں، بلکہ اقوامِ مغرب کا باپ ہے۔ یہ انتہائی چالاکی و چابکدستی سے ان سب کو اپنے حق میں استعمال کر رہا ہے۔ یہ تو پیدا اس نے کمیونسٹوں کو بھی نہیں بخشا۔ کارل مارکس کون تھا؟

آپ مجھ سے کہیں بہتر جانتے ہیں کہ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی سپر پاور امریکہ ہے اور امریکہ ہی یہودیوں کی جان و مال کا محافظ ہے، لیکن یہ سپر پاور یہودیوں کے بغیر ادھوری ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ امریکہ کی معیشت یہودیوں